حیاتِ جاوید

جس میں

عالی جناب جوّادُالدّولہ عارِف جنگ ڈاکٹر **سر سیّد احمد خان** (غُفِرَلَہٗ ۱۳۱۵ھ)

کی زندگی کے حالات اور اُن کی سرکاری، ملکی، قومی اور مذہبی خدمات

مفصّل بیان کی گئی ہیں

تالیف لطیف

مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

1979 1st ed.
1982, 2nd ed.

"دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اُس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان مجرمِ سرد مہری کے قوم حکمراں کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سرد مہری پر کچھ متحیر نہ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس سلوک کے تم اَور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی اُسی طرح اُن کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے۔"

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے مندرجہ ذیل سوال لکھا تھا "سوال اے علما و محققانِ شرع اسلام تمھاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اُس غنیم کی مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں سرسید نے اوّل اصول اسلام کی رو سے ایک بہت لمبی تقریر کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے، اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے رہیں، اذان جس قدر بلند آواز سے چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں، شارع عام میں دعوتِ اسلام کر سکتے ہیں، پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں اُن کا جواب بلا خوف و خطر دے سکتے ہیں، خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے ہیں، اُس کے برخلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت اور اندیشہ کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں مسلمان کر سکتے ہیں اُس وقت تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کیے جائیں گے، کیونکہ اُن کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کا توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔"

"اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آیندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان

کیا کریں گے؟ کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے، بلکہ میری دانست میں تو شاذ رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے۔ چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں اُن میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی پولٹکل حالت اُن سے کروائے گی اور میری دانست میں یہ سخت سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ مسلمانوں سے پس اس لحاظ سے اُس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے۔"

سرسید نے جو کچھ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر لکھا تھا اس کا حال بقدر ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اس مقام پر آنریبل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر کے اُس شریفانہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ اُن سے ظہور میں آیا۔ اُنھوں نے مدرسۃ العلوم کے پختہ بورڈنگ ہوس میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جب وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمڈن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور اُن کی کوششوں کی بے انتہا تعریف اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔

ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم ہونا

فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اُس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسۃ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۳۱ اگست ۱۸۷۳ء کو علیگڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علیگڑھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے، وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری

سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اپیلوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۲۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دوسرا جلسہ علیگڑھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسۃ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، اس کے رفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علیگڑھ میں قائم کیا جائے جس کے طریقۂ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصول اسلام کے برخلاف نہیں ہے، اس تجویز کو سب نے پسند کیا۔ اور بعض علمائے اہل اسلام نے جو اُس جلسہ میں شریک تھے طریقۂ تعلیم کو جو سکرٹری نے اُس وقت بیان کیا بلا ملاحظہ شرعی تسلیم کیا۔ اس جلسہ میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندہ کی رقم زیادہ لکھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقامات میں جاری کرنے قرار پائے تھے اُس کی طرف سے علیگڑھ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان کر دیا تھا، اس لیے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگڑھ میں مدرسہ ماتحت جاری کیا جائے مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی نے جو اُس وقت علیگڑھ میں سبارڈینیٹ جج تھے نہایت دلی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقاصد کو انجام دیا اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء جو کہ ملکۂ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکور پر سرسید بھی بنارس سے علیگڑھ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ تھے رسم[1] افتتاح

---

[1] افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر مرحوم اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر بطور مبارکباد کے اور مولوی صفدر حسین نے فارسی اور اردو میں قطعات تاریخ لکھے تھے چونکہ یہ سب تحریریں طولانی ہیں اس لیے صرف قطعۂ تاریخ اردو مرتبہ مولوی صفدر حسین جو مضمون اور مادۂ تاریخ دونوں کے لحاظ سے نہایت لطیف و عمدہ ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ

ہے مدرسہ علیگڑھ میں اک نہج مقرر — جس کو کیا ہے جاری اسلامیوں نے مل کر
گر یہ نہج تو وہ ہیچ اور وہ نہج تو کیا ہے — بے اسکے ہے وہ تیرہ اسکے ہے وہ منور
ہر علم و ہر زباں کی تعلیم ہوگی اس میں — سب سے سوا ہے اچھی سب کالجوں سے بہتر
انگریزی عام ہوگی تعلیم میں مگر یاں — ہے جسم مدرسہ کا انگریزی اور اس میں تعلیم مذہبی ہے بس جان کے برابر
تعلیم مذہبی ہی ہے جان مدرسہ کی — عیسائی اور مسلماں میں شامل جسم و جاں ہیں — مذہب کی خاص ہوگی تعلیم اور دروں
تعلیم دینوی ہے بہر معاش دنیا — تھا شرع موسوی میں افراط حد سے زائد — ورنہ اثر نہ ہوتا اسکا کسی کے دل پر
شرع محمدی نے کی اعتدال میں — تعلیم مذہبی ہے بہر نجات محشر — افراط کو گھٹا کر تفریط کو بڑھا کر

(باقی)

عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی تاریخ مذکور سے لے کر اب تک مدرسۃ العلوم کو قائم ہوئے ۲۴ برس کا زمانہ گذرا ہے، اس عرصہ کے تمام واقعات و حالات جو مدرسہ مذکور کے انتظام اور ترقی سے متعلق ہیں اُن کے لکھنے کے لیے ایک مجدا کتاب کی ضرورت ہے اس لیے یہاں ہم صرف ضروری امور بیان کریں گے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔

جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علیگڑھ اور اُس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانہ میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریٹ ہوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اُس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی قریب ۴۰ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے کمیٹی کی طرف سے اُس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت ہنری لارنس علیگڑھ میں کلکٹر تھے اُنھوں نے اُس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیج دی اور سر ولیم میور نے بھی جو اس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے کا وعدہ کر لیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ مانٹی گیوٹ صاحب علیگڑھ میں قائم مقام کلکٹر ہو گئے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ اُن کے بعد جو مسٹر کالون مستقل کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے اُنھوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اُس وقت کے تمام یورپین حکام اُن کے ہم رائے اور ہم زبان ہو گئے یہ ایسی سخت مزاحمت ہوئی تھی کہ بانیانِ کالج اُس کے ملنے سے مایوس ہونے لگے تھے اور قریب

قالب ہیں وہ مذہب شرع محمدی کا — اس کو ذرا سمجھنا اے اعظم سمجھ کر — سرکار سے چھڑائی اسلامیوں کی نفرت
اس مدرسے کے بانی کی وضع بھی ہے ایسی — جس سے ثبوت ہوگا اس قاعدہ کا اکثر — اسلام کی ترقی اسلامیوں کی شوکت
پتلون و کوٹ اچکن ملبوس ظاہری ہے — پر شرع احمدی کا جبہ ہے جان کے اندر — اس شخص کی بدولت ہم سب کو ہے میسر
توریت کا ہے عالم انجیل کا ہے ماہر — شرع محمدی کا خاکا ہے یہ مقرر — تھا دشمنو نکارو لا اُسپر بھی اے لیکن
سرکار کی بھلائی اسلامیوں کی خاطر — کیا کیا نہیں کیا ہے اس شخص نے ہمارے — دکھلا یا صحبِ قومی یہ مدرسہ بنا کر
سرکار کی بھلائی اسلامیوں کی الفت — اسلامیوں کی الفت سرکار میں بڑھا کر — ہر بات کو ہماری پڑتا ہے یہ ملا کر
تاریخ بھی لکھی ہو وہ ہے جس سے حضرت — ظاہر میں عیسوی ہے باطن میں وہ ہجری — اے سامعین سنیے للہ دل لگا کر
تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ کی — بولا یہ ہم غیب اٹھارہ سے پچھتر

۱۲۹۲ھ

تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے اُسی زمانے میں سرجان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان ہے لفٹنٹ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ کے دنوں میں علیگڑھ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنارس سے علیگڑھ پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہز آنر نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس کے بننے سے پہلے اُس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا جایا کرے اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو جس قدر عمارات کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی اُن سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں اور سرجان اسٹریچی نے اُس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطائے اراضی کمیٹی کو عنایت کی اور حسب ضابطہ قطعۂ مذکور پر قبضہ دلایا گیا۔ مدرسۂ ماتحت کے افتتاح سے پہلے یہ زمین کمیٹی کو مل چکی تھی اور جس بنگلہ میں اب تک محمڈن ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اس بنگلہ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲ نومبر ۱۸۷۵ء کو سر ولیم میور جو اُس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے مدرسہ کے ملاحظہ کو آئے اور ایک لمبی اسپیچ دی جس میں کمیٹی کو مبارکباد دینے کے بعد سرسید کی نسبت کہا کہ میں خاص کر اپنے دوست کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے اور اُن کے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر اُن کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور مدرسہ کو جاری ہوئے ایک سال گزر چکا تو سرسید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسے کی تکمیل میں اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کی جائے کچھ تو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسے کے کام میں حارج ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جبلی احتیاط کے سبب سے سرکاری عہدہ دار ہونے کی حالت میں چندہ وصول کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ پنشن کا نقشہ تو وہ مدرسہ کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے۔ جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن کی منظوری بھی آ گئی اور وہ اُسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علیگڑھ چلے آئے اور اپنی قدیم

کوٹھی جو علیگڑھ میں تھی دلایت جاتے ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں قائم کیا جائے تو سید محمود نے اپنے اور سرسید کے رہنے کے لیے ایک اور کوٹھی خرید لی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سرسید بنارس سے آئے تو اس کوٹھی کو بھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علیگڑھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے اُن کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں ضلع قرب و جوار کے رؤسا بھی شامل تھے۔ اس جلسہ میں سرسید کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جس میں اُن کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لیے اُن سے ظہور میں آئے۔ سرسید نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بعینہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اُس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں ابتک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز ابتک رہتے ہیں، جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اُسی میں میری خاک مل جائے گی، صرف مدرسۃ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسانِ ضلع علیگڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؟ دور و دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ

کے زیر سایہ پڑی ہے۔"

فونڈیشن سٹون کا جلسہ

الغرض سرسید علیگڑھ میں آکر ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے کالج کی عمارتوں میں جلد جلد ترقی ہونے لگی۔ ہندوستان کے اطراف میں چندہ کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علیگڑھ صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔ ۱۸۷۵ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ پہلے یہ تجویز ٹھیری تھی کہ لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائے گی، لیکن لارڈ ممدوح کو کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے بیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ پھر سر جان اسٹریچی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقتِ معین پر نہ آسکے۔ آخر لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کے ہاتھ سے اُس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ادا ہوئی۔ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد دلی سے مدرسۃ العلوم میں آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۶ء کو مع لیڈی لٹن کے علیگڑھ میں تشریف لائے اور سرسید کے ہاں مہمان ہوئے۔ سہ پہر کو وقتِ معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فونڈیشن کے موقع پر تشریف لے گئے۔ اوّل سید محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے اُس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرسید نے بنیاد کا پتھر رکھنے کی درخواست کی چنانچہ حضور ممدوح نے بنیاد کا پتھر اُس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگ مرمر کا کتبہ بنیاد کے قریب لگا ہوا ہے، اپنے ہاتھ سے رکھا اور فونڈیشن کی تمام رسمیں یورپین طریقہ کے موافق ادا کی گئیں۔

وائسرائے نے علیگڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جلدیں اپنی تصنیفات کی سرسید کو بطور یادگار کے عنایت کیں۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں اُن کو ایک کشتی نقرئی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر یہ عبارت کندہ تھی "بیادگار رکھنے بنیاد کالج کے بدست خاص وائسرائے

بتاریخ ۸ جنوری ۱۸۷۶ء و نشان اعزازبخشی و دوستی از جانب رابرٹ لارڈ لٹن جی۔ سی۔ بی۔ وجی۔ ام۔ ایس۔ اے وائسرائے و گورنر جنرل ہند بمولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی۔ پریسیڈنٹ اینگلو اورینٹل کالج اہل اسلام مقام علیگڑھ۔ تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۶ء"

سید محمود نے جو سکیم ۱۰ فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے، پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام "محمدن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی" رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے، اور بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے اُس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اُس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمدن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ اِن ایڈ نہیں دینے کی۔ باوجود اس کے سرسید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اُن کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا، تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلوسسٹم جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اُس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اُس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلوشپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، نہ طالب علم اور نہ اُن کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی

مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فوزِ عظیم سمجھا جائے۔ الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال انھوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ انھوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔

نہ ہو تابِ پرواز گر آسماں تک — تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

چندہ وصول کرنے کی تدبیریں

مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے، دوسرے جس وقت مدرسہ کے لیے تحریک شروع ہوئی اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہوگیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے۔ اخباروں اور رسالوں میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے چندہ وصول کیا گیا ہوگا سو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے، سرسید نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اُس سے پہلے جس قدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علیگڑھ، لاہور، پٹنہ، مرزاپور اور پٹیالہ وغیرہ سے ہوا، بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے انھوں نے اپنے چند ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاصکر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ نہ ہوتا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سرسید نے ولایت جانے سے پہلے ایک روز نواب امین جان مرحوم سے جو اُن کے قریب رشتہ دار تھے برسبیل تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے نہایت تعجب سے کہا "تم کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو؟ مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے

بھی وصول نہیں ہو سکتے"۔ اس حکایت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت چندہ جمع کرنے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ کی عمارت تیار ہوگئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سالانہ تک اُس میں خرچ ہونے لگا۔ ایک ایرانی سیاح نے مدرسہ کو دیکھ کر خود ہمارے سامنے یہ الفاظ کہے "واللہ معجزہ مینماید کار یکہ از سلطنت برنیاید چگونہ از یک فرد رعیت سرانجام شد"۔ مگر ہم سرسید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آ سکتا ہے۔

سرسید نے مدرسہ کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھدار اور روشن خیال مسلمان اُس کی طرف گرویدہ ہوگئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اُس کی جانب التفات ظاہر کرنے لگے اور اُس کے معاون بن گئے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفتیں جلتی گاڑی میں برابر روڑا اٹکاتی رہیں مگر کام کی عظمت، اُس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور اُن کی وجاہت اور خود سرسید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا، تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی سقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت اُن پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیلِ حالت کے سدِ راہ تھے شیئاً فشیئاً دُور ہونے لگے، سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اُسی کام میں صرف ہوگا، سب سے زیادہ فراہمیٔ چندہ کا باعث ہوا۔

سرسید کی سب سے بڑی تدبیر جس نے کالج کی عظمت کا نقش خاص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتیں تا بمقدور اعلیٰ درجہ کے اسکیل پر بنانی تجویز کیں اور عمارات کے بنانے میں نہایت جرأت اور

دلیری سے کام لیا۔ اگر روپیہ میں کمی ہوئی تو قرض لے کر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کو قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے، حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اس میں چندہ دینے کی ترغیب ہوئی اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھنی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۳ برس کے عرصہ میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی۔ مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود روپیہ کا محتاج تھا سو اُس کے لیے سرسید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کر کے اُس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اشتہار دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیہ ہوتا ہے، جو شخص اتنا روپیہ دے گا اُس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائے گا۔ مثلاً کالج کے بڑے احاطہ کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی بیس روپیہ قرار دیے اور اس طرح احاطہ کا ایک بڑا حصہ تیار ہو گیا، یا بورڈنگ ہوس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح ایک تعداد کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہو گئی احاطہ کے تین دروازے مقرر کیے اور جو شخص ایک دروازہ بنوا دے اُسی کے نام سے اُس دروازہ کو نامزد کرنا تجویز ہوا، اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کر کے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور جتنے آدمیوں نے پان پانسو روپیہ روپئے دیے اُن سب کے نام اُس میں سنگ مرمر پر کندہ کرا دیے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگار میں بنانی تجویز کیں جن میں اُن کے دوستوں اور ہوا خواہوں نے بطیب خاطر چندہ دینا قبول کیا۔ طالبعلموں کے رہنے کے لیے بہت سے مکان قرض لے کر بنوائے اور اُن کے کرایہ کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ بہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کر کے اُن کی کل آمدنی مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغہ تعمیرات کے سوا کالج کے اور اخراجات کے لیے سرسید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے۔ ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پروا نہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے

بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا لطیفہ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی دورِ میں سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی، سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے، انھوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولتمندوں پر ہوگا، اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی"۔

لاٹری کے سوا انھوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔ اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا۔ جب خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انھیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپیے طلب کیے جس پر انھوں نے ایک معقول رقم ان کی نذر کی۔ اُن کے ایک دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علیگڑھ آئے، آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپیے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمائش گاہ علیگڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے نیشنل وانٹیرٹین کر گلے میں جھولی ڈالی بنی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔

بنی ریڈنگ کا جلسہ اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لیے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسہ کی تجویز ٹھیری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا، لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے، اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں"، جس

وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے ایک مؤثر تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

"کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی نیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اُس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں اُن کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و ریا کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اُس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے، اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔"

"اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی اُن لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب نہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سر انجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے، مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی، والنٹیر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے اُن سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔" اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریر کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ دو اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی۔

ساقیا برخیز و دردہ جام را — خاک بر سر کن غم ایام را
ساغرِ مے بر کفم نہ تا ز بر — بر کشم این دلقِ ازرق فام را
گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں — ما نمی خواہیم ننگ و نام را
بادہ دردہ چند ازیں بادِ غرور — خاک بر سر نفسِ بدفرجام را
دودِ آہِ سینۂ نالانِ من — سوخت ایں افسردگانِ خام را
محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود — کس نمی بینم زخاص و عام را
بادلآرائے مرا خاطر خوش ست — کز دلم یکسر رہ بُرد آرام را
بنگر و دیگر بسر و اندر چمن — ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را
کیست آں سرو سہی کاندر سرش — باختم دین و دل و آرام را
قوم ما! اے قوم ما! کز بہرِ تو — دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب — عاقبت روزے بیابی کام را

غرض کہ سرسید نے مدرسہ کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں جب پہلی بار انھوں نے لاہور میں لکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس اور دانے اور اعلےٰ تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی مخالفتوں کا ذکر کر کے انھوں نے کہا کہ "فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں، مگر اے بزرگان پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے! آپ کے لیے دولت سرائیں ہیں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے، چمار، قلی کافر بُت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اُس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، آپ مجھ کو بھی اس

مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے، اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اُس کا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔"

مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل چندہ کو بھی وہ ویسی ہی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ لوگ دو دو آنے اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم چاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے ناچ کی محفل میں اہلِ محفل سے چندہ جمع کیا، یہاں تک کہ طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسہ کی حقیقت سُن کر خوشی سے چندہ دیا اور اس طرح سو سوا سو روپیہ جمع ہو گیا۔ انھوں نے سید کو اطلاع کی کہ ایسا اور ایسا روپیہ ہے اگر کہیے تو بھیج دیا جائے۔ سرسید نے کچھ پس و پیش نہیں کی اور فوراً روپیہ منگوا لیا۔

مدرسہ کے لیے انھوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، پٹنہ، گورکھپور، الٰہ آباد، مرادآباد، لاہور، امرت سر، پٹیالہ، حیدرآباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور اور دیگر مقامات میں صرف مدرسہ کی دُھن میں گئے۔ لاہور اور حیدرآباد متعدد دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا۔ ہزارہا روپیہ ان سفروں میں اُن کا صرف ہوا۔ اگرچہ اُن کے دوست اور رفیق بھی جو اُن کے ہمراہ جاتے تھے اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا، اس کے سوا ہمیشہ بذریعہ روڈ گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سید کو پورا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار اُن کے ایک دوست نے اُن سے کہا کہ آپ راجپوتانہ کا بھی ایک بار دورہ کیجیے۔ سرسید نے کہا روپیہ نہیں ہے۔ اُن کے منہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا، مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طریقہ انھیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا انھوں نے یہ نکالا تھا کہ جو احباب

دعوت کرنی چاہتے تھے اُن سے نقد روپیہ لے لیتے اور کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو انھوں نے خان بہادر برکت علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہمانداری میں صرف کرنا چاہیں از راہِ عنایت اس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اُس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے کئی مزدوروں کی مزدوری ملی وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی، آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ چند دوست بھی ہوں گے پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھیروں گا اُن پر خرچ کثیر پڑ جائے گا اور وہی مثل ہوگی "گدھے کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن"۔"

حیدرآباد کے پہلے سفر میں جو ۱۸۶۲ء میں سرسید نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب انھوں نے چندہ میں جمع کر دیا تھا جب وہاں سے واپس آئے تو علیگڑھ میں اُن کے احباب نے فی کس بیس روپیہ کے حساب سے دو سو بیس روپیہ اس لیے جمع کیے کہ سرسید کو شکر گزاری کے طور پر دعوت دی جائے۔ سرسید نے کہا اس کا انتظام میں خود کروں گا۔ وہ سب روپیہ ان سے لے کر اور بیس روپیہ اپنے حصہ کے اُس میں ملا کر دو سو چالیس روپیہ کی دو اسکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لیے مقرر کر دیں۔ اُن کے دوستوں نے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لیں گے۔ اس پر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا کہ سید صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دوں گا چنانچہ انھوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔

سید محمود کی شادی میں نواب انتصار جنگ نے سو روپیے بطور اظہار مسرت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کیے جائیں۔ اس پر سرسید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار

میں لکھا کہ "ہمارے بعض دوست نیوتا نہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوتا لینے کو موجود تھے اگر اُس کا روپیہ اسی طرح مدرسۃ العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا"۔ پھر لکھا کہ "بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ نہیں کی، مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں۔ اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانسو روپیہ لگا سکتے تھے، سو ہم نے پانسو روپیہ مدرسہ میں دیدیا"۔ پوتے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۱۸۷۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرسید نے ایک نہایت عمدہ تقریر کے بعد اسی طرح پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیے تھے۔

حیدر آباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈپوٹیشن لیکر حضور نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے، چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا، سرسید کے دوستوں نے جو کچھ اُن کی دعوت میں دیا وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار جنگ نے تو غالباً ہزار روپئے نقد دیدیے تھے مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھوم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی، سرسید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلواؤ۔ محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجیے اور پارٹی بھی ہونے دیجیے۔ سرسید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دیدو۔ آخر پارٹی موقوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرسید کی نذر کیا۔

ابتدائے قیام مدرسہ کے وقت جس طریقہ سے سرسید نے نواب مختار الملک مرحوم کو مدرسۃ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے۔ اُنھوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور اُن کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے سے ظاہر کی گئی تھی اُس کی صورت یہ تھی کہ سرسید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کر لگائے حیران اور فکرمند کھڑے ہیں اور اُس سے کسی قدر فاصلہ پر مختار الملک مع دو مصاحبوں کے استادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آرہا ہے۔ جہاز جس میں بہت سے مسافر سوار ہیں اُس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں اُن ڈوبتوں کے بچانے کو جہاز کی طرف جا رہی ہے۔ اُس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں "وَن

لک ڈوپنیز" سرسید اُس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ "ناٹ سفیشنٹ" (یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے)۔ ایک فرشتہ آسمان سے اُترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسید سے کہتا ہے "لک ایٹ دِس نوبل مین" یعنی اِس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم۔ کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لیے جا رہی ہے اُس سے مدرسۃ العلوم مراد ہے، اُس کے پھریرے پر جو "ایک لاکھ روپیہ" کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اُس وقت تک مدرسہ کے لیے جمع ہوا تھا۔ سرسید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اُبھارنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے۔ اُس وقت خدا کی طرف سے اُن کے دل میں یہ القا ہوا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے۔ فرشتہ کا اُن کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید مُراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی میرے دل پر مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اول تین سو اور پھر پانسو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کیے۔ اُس کے بعد جب حضور نظام نے عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپیہ ماہوار کا دو دفعہ کرکے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سرسید ڈپوٹیشن لیکر حیدر آباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعۃً دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کیا اور اُس کی سند سرسید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اُسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

غرض کہ اسی قسم کی بیشمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آکر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے۔ اس عرصہ میں برابر اُن کو یہی اُدھیڑ بُن لگی رہی کہ کس

طرح روپیہ فراہم ہوا اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں مہیا کیا جائے، اُن کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اُنھوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لیے تھے۔ اولاً اُنھوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرسۃ العلوم کے سوا رفاہِ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قلم بند کر دیے اور جہاں تک ہو سکا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا اور اپنے دل میں ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو اُن کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں اور عزیزوں نے پہلوتہی کی تو اُن کو سو غیروں کا غیر جانا۔ انھوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے جب سے اُنھوں نے مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروت اور لحاظ کو جو اُن کی ایک جبلی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر اُن کا نام اور اُن کی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر اُن کے استمزاج کے لکھ دی جاتی تھی اور اُن کو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی جب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور اِدھر سے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دیے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اُس لکھے کی بدولت مانگتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد

آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرعے لگ جائیں تاکہ حسبِ حال ہو جائے، سو ایک خدا کے بندے نے مصرعے لگا دیے اور اب اُس شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

پیش ازیں سعدیِ روشن دل و آزاد منش — گفت در بابِ گدایانِ سخن از صدق و یقیں
"گر گدا پیشہ و لشکرِ اسلام بود — کافر از بیم تو قع برود تا در چیں"
لیک در نوبتِ ما کار بجائے برسید — کہ بہ کافر چہ رسد خود بتواں گفت چنیں
گر گدا پیشہ و لشکرِ اسلام بود — ہم مسلماں رود از بیم سوالش تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لیے چندہ کھولا گیا۔ سرسید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندہ کا تقاضا کیا۔ انھوں نے بدمزہ ہو کر کہا "صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے"، سرسید نے کہا "ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا"۔ یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی اُن کو دوستوں سے کچھ اُچک لینے کا موقع ملا اُنھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں بکوب"۔ ایک زمانہ میں مسٹر تھیوڈور بک کے والد جو سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اُس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔ آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سرسید نے بہت بدمزہ ہو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔ انھوں نے وہ اشرفی لے لی سرسید نے کہا دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے اور اُن سے لیکر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کر دی۔ اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھیرا کہ جو ہارے پچاس روپے مدرسہ میں دے، اتفاق سے سید محمود ہار گئے، وہ سو روپیہ کا نوٹ لے کر آئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجیے اور نوٹ لیجیے۔ انھوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے

شرط بدنا جائز بھی نہیں ہے۔ سرسید بھی وہیں موجود تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سید محمود کو دیدیے اور نوٹ لے لیا۔

اس قسم کے صدہا واقعات روزمرہ گذرتے تھے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولتمند مسرف یا بخیل، علما زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں، وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی متصور ہو کوئی شخص نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے تئیں اُس کام میں فنا نہ کردے اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقلمندی، شہرت لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اُٹھا سکتا ہو اُن سے آپ دست بردار ہو کر اُس کام پر وقف نہ کردے۔

دوستوں کے علاوہ اجنبی اور انجان آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں اُن کی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر صاحب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا اور اس میں کچھ مسلمان ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسید نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا تھا چندہ طلب کیا۔ اس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسید نے کہا "بیشک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہوگیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے"، وہ انگریز یہ سُنکر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسید کی نذر کیا۔

سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کرلیا تھا کہ کوئی سبی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرسۃ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوششیں بظاہر خاص اپنی ذاتی اغراض کے لیے کرتے تھے اُن سے بھی اگر غور کرکے دیکھا جائے تو خود اُن کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچا تھا جس قدر کہ مدرسۃ العلوم کو پہنچا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے یا پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات یا دوستی یا وجاہت سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرسۃ العلوم کے سوا کسی کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک جلیس سے کہا کہ "تو اوروں کے فائدے کے لیے سفارش مت کیا کر، کیونکہ اس سے تیرے فائدوں میں کمی پڑے گی" اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی اُس کو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کرسکتا، مگر جن معنوں میں سرسید نے اُس پر عمل کیا وہ ایک جوانمردانہ خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں دیکھی گئی۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا بُرا منانا گوارا کرتے تھے اور جو خوشی لوگوں کی سفارش اور حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ سرسید کے ایک معزز ہموطن نے ایک رفاہِ عام کے کام میں اُن کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر کرنا چاہا۔ اُنھوں نے صاف کہدیا کہ میں صلاح ومشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجکو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔ لطیفہ ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گذری ہے جب میری آنکھ کھلی تو مجکو یقین ہوگیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی"، سرسید نے اُس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اُس سے مجھکو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا"

عمارات کالج ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور اُن کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی

جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں محض قومی چندہ سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے انھیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضرور ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور امید ہے کہ اُس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ اس لیے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے مگر جو اصول کہ سرسید نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے انھوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن مصالح سے وہ برخلاف اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے اُن کو کسی قدر بیان کرنا ضرور ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ دلبستگی رکھتے تھے اُن میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں، کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لیے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائیکہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرسید نے کالج کی ترقی بلکہ اُس کا قیام و دوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجہ کی اسکیل پر عمارتیں بنائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لیے جس سے عام لوگوں کو اُس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے اور تعلیم و تربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہمیشہ معدودے آدمی ہوتے ہیں۔ البتہ عمارات کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرسید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا یہ زیادہ تر اُس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا خصوصاً گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظریں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اُس کی

وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کہ ایجوکیشن کمیشن نے علیگڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اُس وقت علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ نے جو کمیشن کی لوکل کمیٹی کے ممبر تھے علیگڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں بورڈنگ ہوس محمدن کالج کی پختہ بارگ کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ "جس وقت میں نے کمروں کی اُس قطار کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی تو مجھکو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آیندہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہ ہو" میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پا کر آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ "انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کینن رابنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کہیں کیمبرج یا آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوائے محمدن کالج کے نہیں دیکھا"

سرسید کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہونا چاہیے تھا کہ آیندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کا عظم و شان دیکھ کر اُس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہل یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اگلوں نے جو کام ادنیٰ درجہ کی حالت میں چھوڑا ہے اُس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اُن کو پورا کر دیں۔ ہم ایسے بہت سے مدرسے اور خانقاہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی اُن کو ناتمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روز میں کھنڈر ہو گئیں لیکن اکثر اوقات عمارت کا عظم و شان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ اُس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت جبکہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ "جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گذرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے"۔ بہرکیف اس انسٹیٹیوشن کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو انھیں عمارتوں کی بدولت ہو سکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اگر (خدا نخواستہ) کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔

سرسید نے ان عمارتوں میں آیندہ نسلوں کے فخر و مباہات کے لیے ایک نہایت مؤثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور پختہ عمارتوں پر اُن کے بانیوں کے اور کالج کے محسنوں، مربیوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کرائے ہیں۔ ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیر تعمیر ہیں، کچھ ناتمام پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھے گی اور اس قومی یادگار کو صفحۂ روزگار سے مٹنے نہ دے گی۔ سنا ہے کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھ کر ایک یوروپین افسر نے کہا تھا کہ "یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے"۔

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں اُن عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو، مثلاً اکثر محرابیں سیرسنک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا بورڈنگ ہوس کے صدر دروازہ کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے، منبت کرایا گیا ہے۔ اکثر انگریزوں کی اپیچیں جن میں مسلمانوں کو غیرت اور اُن کے اسلاف کی عظمت یاد دلائی گئی ہے جا بجا پتھروں پر کندہ کرا دی ہیں۔ جن یوروپین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے اُن کی عالیشان یادگاریں بنوائی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو آیندہ زمانے میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع ملے کہ اُن کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکر گذار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے لیے ماہواری یا سالانہ ایک رقم معین ہونی چاہیے کہ اُس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پائے۔ بیشک یہ ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسید نے جو ہتیلی پر سرسوں جمائی ہے یہ ہرگز ظہور میں نہ آتا اور کالج کی وقعت جو

دفعۃً تمام زمانے کے دل میں پیدا ہو گئی اُس کے لیے ایک مدتِ دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسید کے بعد کسی سے یہ امید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے جاؤ اور امنگ سے سرانجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کراتا ہے۔ حالانکہ سرسید کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہمیشہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام رہا ہے اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے باوجود اس کے انھوں نے اس قطعۂ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادۃ کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلاناغہ دو دو پہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود مدد پر جا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن و توش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، کنوئیں کھدواتے تھے، زمین ہموار کرتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دور دور سے ہر قسم کی پود منگواتے تھے جو اُن کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھی، باوجود ان تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام اُن کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجنیر یا اوورسیر تھا جس سے اصلاح لیجائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لیے گئے انھوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں اس لیے سرسید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا پڑتا تھا اور خود ہی اُس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اُسی طرح کام بنتا ہے یا نہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض یوروپین انجنیروں نے کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتوں کو دیکھکر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجنیر کی اصلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ بااینہمہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجنیرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو۔ لیکن ہم کو اس قومی انسٹیٹیوشن کے لیے ایسا انجنیر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے

خود ہی عمارت بنوائے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، نہایت دیانتداری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرور تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی جس قدر روپیہ آتا جاتا اُسی قدر عمارتیں بنتی جاتیں بعضے اور اور اعتراض کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھایا ہے اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو

مشکلے دارم زدانشمندِ مجلس باز پُرس کار فرمایان چرا خود کار کمتر می کنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سرسید کی لائف میں ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سرسید نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر درحقیقت انھیں کو حاصل تھا، ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں اُن کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو اُن کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسۂ احمدیہ رکھا جائے۔ بلکہ کلکتہ کے اخبار اردو گائڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا۔ مگر سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج اُن کے نام سے موسوم کیا جائے۔ اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے سرسید کی اطلاع اور رضی کے بغیر ایک عمارت اُن کی یادگار میں بنانے کے لیے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ اُن کی یادگار میں بنانا اور اُس پر سرسید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا اُنھوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ امید رکھتے ہیں اُن کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سرسید دو شرطوں پر راضی ہوئے۔

ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے اُس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لیے یہ کالج بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خاں اور حاجی اسمٰعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں کندہ کرایا جائے حاجی صاحب نے پہلی شرط تو باکراہ قبول کر لی، مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کہیں ایسا نہیں سُنا گیا کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کیے جائیں۔ سرسید نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے اور اندرونی جانب حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام بھی شامل کیا گیا۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسید کو مجبور کر دیا تھا بڑی وجہ سرسید کے راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ اُن کو اپنی یادگار کے حیلہ سے احاطۂ بورڈنگ ہوس اور کالج کا صدر دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور بورڈنگ ہوس کے چھ پختہ کمرے تیار ہوتے نظر آتے تھے جن کا بغیر اس حیلہ کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶ جون ۱۸۸۱ء کے جلسۂ کمیٹی یادگار سید احمد خاں"، میں مولوی سید فرید الدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندہ سے بورڈنگ کی ایک ضروری عمارت کا بننا تجویز نہ کرتے تو سید احمد خاں اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض یوروپین افسروں نے یہ تحریک کی کہ یہاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فونڈرز ڈے (یعنی بانی مدرسہ کی سالگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں ہر سال کالج کے ہوا خواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ "ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروروں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس

کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہو اُس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کیجائے، اس لیے میرے نزدیک بجائے فونڈرز ڈے کے فونڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے" چنانچہ اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لیے اپنی یادگار قائم کرنے کی مخالفت کی تھی؟ تمام دنیا میں اور خاص کر اُن ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں، یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد اُن لوگوں کی شکر گذاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں اور اُس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ناشکری و احسان فراموشی کا دھبا نہ لگے اور آیندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیر خواہی کا حوصلہ پیدا ہو۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کے کرنے سے سرسید لوگوں کو مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے اور محض قوم کی خیر خواہی میں اپنی عمریں صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور جہاں ہر زمانے میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر جو ایسے کام کرتے ہیں خود غرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا بلکہ ادنے سے لے کر اعلےٰ اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے اُن کی عزت کرتے ہیں، اُن کا احسان مانتے ہیں، اُن کو مدد دیتے ہیں اور اُن کی شکر گذاری اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کا حال اس کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں کہ کوئی شخص بے شائبہ غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے، رات دن اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لے، اس لیے اگر حسن اتفاق سے قرنوں اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اس کا نمونہ قوم میں موجود نہیں ہوتا۔ اس لیے اُس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رخنے بند کرنے پڑتے ہیں تاکہ قومی رفاہ کے کام میں خلل واقع نہ ہو

اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ کر امداد اور اعانت سے پہلو تہی نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر جس کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا کسی وجہ سے جو سرسید اس مصلحت کا لحاظ نہ کر سکے تو نہ صرف اُن کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست اُن کی طرف سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

تعلیم کالج میں اول دو دو پارٹمنٹ قائم کیے گئے تھے ایک انگریزی ڈپارٹمنٹ جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اورنٹیل ڈپارٹمنٹ جس کی پڑھائی مقرر کرنی کمیٹی کے اختیار میں تھی اور اُردو میں علوم جدیدہ اور فارسی و عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھائے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے لیے بطور سکنڈ لینگویج کے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لیے سرسید انگلستان سے بڑے بڑے نامور علما و فضلا سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس میں ہر فن کے علما نے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں اُن کا ترجمہ کرا کر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کی پڑھائی میں داخل کریں مگر سوا اس کے کہ شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ نے اُس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اُس سے پیدا نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے مگر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزل کرتا جاتا تھا یہانتک کہ بلا مبالغہ طلبہ کی تعداد سے استادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ طالب علموں اور اُن کے مربیوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید دنیوی فائدے کی نہ تھی اس لیے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اُس کو توڑ دیا گیا۔ مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائے گا، روز بروز ترقی کرنے لگا۔

کالج کلاس قائم کرنا ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ابتدائی مدرسہ کھولا گیا تھا اور یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی۔ نیز اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے

ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ایفلیئیٹ ہوگیا۔ جو ترقی گذشتہ ۲۳ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کالج نے کی ہے اُس کے متعلق مفصل حالات کالج کی سالانہ رپوٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں، یہاں ہم صرف اس قدر دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبۂ شمال مغرب و اودھ کے مسلمان گریجوٹس[1] کی تعداد میں بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

۱۸۹۳ء میں جو لکچرآنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علیگڑھ دیا تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبۂ مذکور کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں سنہ مذکور تک مسلمان گریجوٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اُس کو صفر سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجوٹس فیصدی ۴٫۵۹ ہونے چاہییں وہاں اُن کی تعداد ۳٫۴ سے زیادہ نہیں نکلی، اسی طرح مدراس میں بجائے ۶٫۸ کے صرف ۹٫ اور بمبئی میں بجائے ۲۱٫۵ کے ۱٫۲ اور پنجاب میں بجائے ۱۱٫۹ کے ۲٫۵ فیصدی برآمد ہوئی تھی برخلاف اضلاع شمال مغرب و اودھ کے جہاں نسبتہً مسلمان گریجوٹس کی تعداد ۱۱٫۲ ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکور تک اُن کی تعداد ۱۰٫۶ تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمڈن کالج نے قطع نظر اور فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا خاص کر ترقی تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس قلیل عرصہ میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچایا۔

تفسیر القرآن معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق

[1] صوبۂ شمال مغرب و اودھ کے گریجوٹس سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اُس صوبہ کے کسی کالج میں تعلیم پاکر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو نہ صرف وہ گریجوٹ جو خاص صوبۂ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے پنجاب سے آکر محمڈن کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے ۱۲

میں اُس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہانتک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، اُن کے دل میں مستثنےٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر برہانی اعتقیۃً عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلہ پر اُن کو ملتا رہا ہے۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے اسی لیے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں چنانچہ ۱۸۶۶ء میں کہ یہی زمانہ اُن کے تفسیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے انھوں نے ایک اسپیچ میں خاصکر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہوگی"

لیکن باوجود اس اندیشہ کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر جانتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ جیسا کہ اُنھوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے اُن کو یہ بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جس کو وہ ہمیشہ ٹھیٹ اسلام سے تعبیر کرتے تھے، اُس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے اُن کا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصور کرتے ہیں اور اس لیے

مسلمانوں میں اُن کا پھیلنا نہیں چاہتے، وہ درحقیقت اسلام کو بہت بودا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ اُنھوں نے ایک موقع پر کہا کہ "یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعوے کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے، اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا"۔ البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جس مجموعہ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانا اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض اُن کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اُن کا انسداد کیا جائے۔ لیکن جو طریقہ استدلال کا زمانہ گذشتہ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ہمارے متکلمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہوگیا وہ کسی طرح فلسفۂ حال کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ برخلاف یونانی فلسفہ کے جس کا مدار محض قیاس اور ظن و تخمین پر تھا، فلسفۂ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اُسی طرح اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علما جو فلسفۂ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے، اُن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ نہ صرف کرسچینٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے

ارادہ میں کم و بیش کامیابی حاصل کرسکتے۔ اُن کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش نے آزادی کا جوہر اُن کی طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

بہرکیف سرسید کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلم الثبوت علما اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس اُنھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ اُنھوں نے اپنی ایک اسپیچ میں اس معاملہ کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ "جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلاشک اُن کا ایمان اور اُن کا یقین بہ نسبت اُن لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ اُن کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے۔ . . . . میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اُن کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم جانتا ہوں . . . خدا کے ماننے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے اُن کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں۔ کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابل یقین صحیح یا غلط اُن کے سامنے یہ کہہ کر کہ "خدا و رسول نے فرمایا ہے" بیان کیجائے، وہ فوراً اُس پر یقین کریں گے پس ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں اُن کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں"۔

"مگر اُن کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اُس کو بتائے جائیں اور اُس کے دل کے شبہے مٹائے جائیں تاکہ اُس کے دل کو تشفی ہو۔ . . . وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو دُھکڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈر یا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کہا کرے۔ یہی وہ

لوگ ہیں جو ہمارے مخاطب ہیں اور جن سے ہم کو بحث ہے۔"

"جس زمانہ میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی . . . اُس وقت مسلمانوں میں فلسفۂ یونانی اور علم نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کیونکہ جو لوگ اُن مسائل فلسفہ علم طبیعی کو سچ جانتے تھے اور اُن میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے اُن کو اسلام کی نسبت شبہ پیدا ہوتا تھا . . . وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملہ سے بھی اُس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علما کو اُس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور اُنھوں نے اُس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی۔ خدا اُن کی کوششوں کو قبول کرے . . . . پس میرا خیال ہے کہ جس زمانہ میں اسلام کی ایسی حالت ہو اور اُس پر ایسا ہی حملہ ہو جیسا کہ اس زمانہ میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیاقت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اے دوستو تم خوب جانتے ہو کہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہے جس کے مسائل اُن اگلے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ مسائل اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اُس زمانہ میں تھے . . . مگر اس زمانہ کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اُس زمانہ کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے . . . ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑ دیں اور اُن کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں . . . مسائل علم طبیعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ دکھلا دیے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اٹھا دیے جائیں یا اُن تقریروں اور اصولوں سے جو اگلے زمانہ کے عالموں نے قرار دیے ہیں ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں۔"

"اس لیے اس زمانہ میں . . . ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھیرا دیں۔ یا اسلامی مسائل کو اُن سے مطابق کر دکھائیں اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں میں اُن سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین

کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا اُن کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار ہیں اور یقیناً گنہگار ہیں۔"

"میں ایک شخص ہوں جس کا یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہو اور اُن تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانہ میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے۔ میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے، اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی اُن کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اُسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ اُن غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی ہیں۔"

"میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے اُن غلطیوں کے سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا دعوے کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں، یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس و باعلم لوگوں کا ہے، مگر جب کہ میں مسلمانوں میں اُن علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اُس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔"

"اے میرے دوستو میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھکو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں، اور کچھ چارہ کار نہ تھا تو مجھکو ضرور وہی کرنا تھا

جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے؛ اگر میں نے بُرا کیا ہے وہ چاہے گا معاف کرے گا چاہے گا نہ کرے گا؛ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اُس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر و نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ بُرا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں کافر بتلاتے ہیں میں اُن سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا، جو بھلا یا بُرا میرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آئندہ ہوگی خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔"

الغرض سرسید نے مذکورۂ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لیے اول اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی دریافت کرنے کا پیمانہ قرار پا سکے یعنی یہ کہ اُس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو۔ کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اُس کے فعل اور اُس کے قول میں مطابقت ہونی ضرور ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے اس امر پر غور کی کہ اسلام جس کی نسبت ہمارا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی بات علم و حکمت و صداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانونِ فطرت کے مطابق ہے اُس سے کیا مراد ہے؟ اور اُس کی حد کیا ہے؟ اور اُس کے ثبوت کی بابت ہم کہاں تک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اس امر کے متعلق اُنھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزماں کے دل میں القا ہوا ہے اُسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اُس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کیجائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے پس اُنھوں نے جیسا کہ حضرت عمر سے منقول ہے کہ "حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ" اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا، اور اُس کے سوا تمام

مجموعۂ احادیث کو اس دلیل سے کہ اُن میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علما و مفسرین کے اقوال و آرا اور تمام فقہا و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ اُن کے جوابدہ خود علما و مفسرین اور فقہا و مجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث سے خارج[1] کر دیا۔

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اول اول جب تک کہ تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلا لحاظ ترتیب کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور ضمیمہ کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے رہے۔ مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہو گیا اور سرسید سرکاری خدمات سے سبکدوش ہو کر بنارس سے علیگڑھ چلے آئے تو اُنھوں نے ابتدا سے قرآن مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اس وقت سے اخیر دم تک جب کبھی اُن کو اور کاموں سے فرصت ملی برابر اُس کے لکھنے میں مصروف رہے اور قریب دو خمس کے تفسیر لکھنی باقی تھی کہ پیام اجل آ پہنچا۔

جس اصول پر سرسید نے تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اُس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہدینا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے مگر اُس کی تمام جزئیات کو قانون فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اُس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں اور باوجود اُن بیشمار مشکلات کے جو تفسیر لکھتے وقت اُن کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

---

[1] سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اس قدر ہے کہ کوئی اعتراض سائنس کی رو سے قرآن مجید پر وارد نہیں ہو سکتا اس لیے اُنھوں نے اپنی بحث کا موضوع محض قرآن مجید کو قرار دیا ہے اور مجموعۂ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعۂ کتاب و سنت و اجماع و قیاس پر کرتے ہیں اُن کو اسلام کی حمایت کے لیے ضرور ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حملہ سے بچائیں، عام اس سے کہ اُس کو سائنس کے مسائل پر منطبق کریں، یا اُس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا بطلان ثابت کریں یا اُن کو غیر محقق ٹھیرائیں ۱۲

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصہ میں بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں با اینہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ اُن کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جن میں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی نہیں سمجھا کہ سید احمد خاں نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر اُنھوں نے اکثر جگہ تمام مفسرین سے اختلاف کیا ہے جس طرح بعضے چالاک وکیل کسی حیلہ سے جج کو فریق مخالف پر افروختہ کرکے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گُر نکالا ہے کہ سرسید کو کہیں شیطان کا منکر، کہیں فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو اُن سے اور اُن کی تفسیر نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ فی الواقع حمایتِ اسلام کی نظر سے سرسید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو اُن کو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ انگریزی تعلیم مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرہ کی چیز ہے یا نہیں اور اگر ہے تو آیا اُس کا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں اُن کا جہاں تک ممکن ہو استیصال کیا جائے، اس کے بعد اُن کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ سرسید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کرنے کا اختیار کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں اگر ٹھیک ہے تو اُنھوں نے کہاں تک قرآن کی تفسیر اُس طریقہ کے موافق کی ہے اور کہاں کہاں اُس سے انحراف کیا ہے اور اگر وہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر کونسا طریقہ ہے جس کو اس مقصد کے لیے اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اُس طریقہ سے اُن شبہات کا جو علوم جدیدہ کی تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استیصال کیا جائے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے

مراتب مذکورۂ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام ہمت اس بات میں صرف کی ہے کہ سرسید کی نسبت لوگوں کے تعصبات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ اُن کی تفسیریں کی زیادہ قدر ہو اور لوگ اُن کو بہت بڑا حامیِ دینِ اسلام سمجھیں۔

لطیفہ ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں، آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجے، میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے سفارش کر دیں۔" سرسید نے اُن کو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگیِ معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"